سید امیر علی
ترجمہ محمد ہادی حسن

دُنیائے قبل از اسلام پر ایک نظر

(۲)

پہلی قسط میں ظہورِ اسلام تک ہندو مذہب جن مراحل سے گزرا اور آخر میں وہ کس پستی پر پہنچا، اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد ایران میں آباد ہونے والی قوموں اور ان کے مذاہب کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس قسط میں زرتشتیت، یہودیت اور عیسائیت پر تبصرہ ہے۔ (مدیر)

فتح بابل سے مذہب کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہب ثنویت کی حکومت قائم ہو گئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی اُس کے صلے میں اُنھوں نے قدرتی طور پر اُسے "مسیحا"، "نجات دہندہ" اور "شفیعِ عالم" کے القاب دیے۔ عبرانی قبیلوں کی اسیری، ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب ان کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت اُن کا ایرانیوں سے اختلاط، یہ چیزیں غالباً زرتشتیوں کی اُس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں جو دارا یوش ہستاسپ کے تحت ظہور میں آئی۔ فعل و انفعال کا دو طرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیطِ کل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انھوں نے ایرانیوں سے ایک سماوی سلسلۂ مراتب اور خیر و شر کی تخلیق کے اصولِ دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی رُوح داخل کر دیتا ہے۔ اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی و اخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہدِ حکومت ملک گیری کا دور تھا تنظیم کا دور نہ تھا۔ دارا یوش کا عہدِ حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہرمزد کا پکا پرستار تھا اور اپنی ساری فتوحات کو اُس کا احسان کہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے، مادیوں کی مجوسیت کا قلع قمع کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنائے۔ لیکن انحطاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا وہ کسی کے روکے رُک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں جن کا اُس نے اپنے عہدِ طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بُت پرستوں کے لیے عذاب کے فرشتے

تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انھوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (APIS) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، انھوں نے بہت جلد مُہر مزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کے سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پُرانی مجوسی عناصر پرستی از سرِ نو تازہ ہوگئی، اور دارا یوش کے ایک قریبی جانشین اردشیر نیمون (ARTOXERXES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پُوجا رائج کرائی: یہ کلدانی دیوتا مِلتا یا اناتی تیس کا مثنیٰ تھا اور اس کے ساتھ لِنگ پُوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پُوجا کا نشو و نما پا کر خوب صورت سُورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہوجانا تاریخ کے عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سُورج پہاڑوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا، بیل کو باڑے میں لے جا کر ہلاک کرتا ہوا اور اُس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفارا ادا کرتا ہوا یہ ایک ایسا تصوّر ہے جو دُنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا اَن مٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ متھرا کی پُوجا کو رُومی لشکری وادیِ فرات سے یورپ کے دُور ترین گوشوں میں لے گئے، اور قیصر ڈائیو کلیشین (DIOCLE-TIAN) کے زمانے میں وہ رُوما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے جو حالات تھے اُس سے بد تر اور کبھی نہ ہوئے تھے۔ وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں۔ منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی، اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت قاعدہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا اُس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا۔ لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملے میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہ تھے۔ وہ اپنی قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا (IONIA) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (GYNAIKONITIS) میں بند رہتی تھیں، جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے۔ اور انھیں سرِ عام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہر حال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس نہ کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لیے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آ رہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا اور معاشرے کی رگ وپے میں ساری تھا۔ بہر حال ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اُن کے یہاں کوئی ایفرو ڈائٹی پینڈیموس (APHRODITE PANDEMOS) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اُس اخلاقی وبا میں مبتلا نہ تھا، جو تمام

بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور جو یونان میں عام تھی اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کر سکی۔[1]

جب ہنما منشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشت دنیا کی ترقی میں ایک قوتِ محرکہ نہ رہی فاتحوں کے اُن ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے معاشرتی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندرِ مقدونی کا ظفر مندانہ حملہ بھانت بھانت کے جتھے جو اس کے جلو میں آئے، ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ، سلیشی، صُوری، پمفیلی، فریزی اور لاتعداد دوسری قوموں کے لوگ، نیم یونانی، نیم ایشیائی، جو گار کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آکر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے، اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے، اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج۔ ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ قومی زندگی کے نمائندے مؤبد فاتح کی چیرہ دستیوں کے تختۂ مشق بنے، کیونکہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہابِ ثاقب کی طرح تھی۔ قصّے کہانیوں کا جو تانا بانا اس کی شخصیت کے گرد بُنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے، اُسے ہٹا بھی دیا جائے تو اس صورت میں بھی وہ عظیم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، جس میں اعلیٰ درجے کی اولوالعزمی تھی، ایک ایسی زبردست فطانت تھی جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آجاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی جس کی بدولت وہ اپنے ارد گرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اُس کی طبیعت ایک اجتماعِ ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد، جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے اور خود ساری دنیا سے خراجِ عبودیت وصول کرے۔ اور دوسرے وہ فلاسفہ و حکما کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز ذلیتوں سے ملوث تھی۔ اُس کا ایک مدّاح ذیل کے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے: "صُور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوقِ غلامی پہنانا، ہندوستان اور باختر میں اُس نے جو ہنگامۂ قتال برپا کیا، کلائٹس کا قتل، فلوٹس اور وفادار پارمینیو کی موت کے جو فرمان اُس نے جاری کیے، طوائفوں کے کہنے پر تختِ جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا، یہ سب ایسے کام تھے جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش

---

[1] DOLLINGER. THE GENTILE AND THE JAW, VOL. II, P. 239

نہیں کر سکی"۔ سکندر کی فتح یابی اور ہنامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایات نے لے لی۔ اساطیر الصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی حکومت اور رائے سے ایک نئی، قومی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب و عقائد اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سلیوکی حکمرانوں کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل ثابت قدمی سے جاری رہا۔ اینٹیوکس ایپی فینیز کو، جس نے یہودہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے، یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسر اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سرعت آگئی۔ سلیوکی فرماں روا دجلہ اور ارونٹیز کے کناروں پر حکمران تھے: پارتھیوں نے ہنامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قائم کی: یونانی باختری خاندان مشرقی علاقوں، یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ پارتھیوں کے تحت مزدیکیت اگرچہ بالکل ختم نہ ہو گئی، پھر بھی حکمرانوں کی نظر بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جن علاقوں میں امن وامان تھا وہاں زرتشتیت مادیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہو گئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اُسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی جو ملک کے دُور دراز حصوں میں روپوش تھے۔ لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے جبری تعدی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔ چنانچہ مجوسی زرتشتیت نے از سر نو مذاہب عالم کی صف میں سر اُٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اُسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے موبدوں کو اعیانِ مملکت کے منصب عطا کیے۔ ایک قریب مرگ مذہب کے یہ آخری نمائندے اُن تمام اُمیدوں کا مرجع تھے جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیر سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزمانہ اُمنگیں کہاں تک پوری ہوئیں، یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی، یعنی اُس کی قومی زندگی، تو بحال ہو گئی، لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پذیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیا حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رستم کی طرح مُردہ ہو چکی تھیں۔

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے۔ بارہا انھوں نے روما کی فوجوں کو شکست دی۔ اُس کے شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ اُس کے قیصروں کو قیدی بنایا، اور اُس کی رعایا کی دولت لوٹی۔ لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتشکدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی، لیکن لوگوں کے دلوں میں بجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی۔ اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذاہبوں کو دبانے کی کوشش کی اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا اُس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے، اُس کے اشراف و اعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اُس کے موبد اور کشیش جس تکبر کا شکار تھے، اُن سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کیے جاتے تھے، وہ رعایا کی جان و مال پر کُلی اختیار رکھتے تھے، اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اُس اشتراکیت کا پرچار کیا جس سے یورپ حال ہی میں آشنا ہوا ہے اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ وہ آگ، پانی اور گھاس کی طرح دولت اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں نجی املاک کو ختم کر دیں، اور دنیا کی اچھی اور بری چیزوں میں برابر کے شریک ہوں[1] مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور دختروں کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی جائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چنانچہ مزدک، جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا، قتل کر دیا گیا۔ لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے، وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں۔ اس فالِ بد کو کسریٰ نوشیروان کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روک کے رکھا، لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہرحال ایک معلمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جسے دنیا کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونکنی تھی۔

---

[1] "دبستانِ مذاہب" از محسن فانی۔ شیخ محمد اقبال کی کتاب (DEVELOPMENT OF META PHYCIES

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور اُن کے حالات میں بڑے بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جوڈیا میں ملت موسوی پے بعد دیگرے کوشش اُن میں قیامت کبریٰ قیصران ٹائی ٹس اور ہیڈرین کی جنگیں تھیں۔ روم نے اُن کے ہیکل کو مسمار کر دیا تھا اور تیغ و آتش سے اُن کا بحیثیت ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اُتنی ہی بے رحمی سے اُن کو مظالم کا نشانہ بنایا۔ لیکن انھوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انھوں سے شقی القلب جابروں کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھائی تھیں اُن سے انھوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر، قبرص اور سپین کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بودوباش کر رہے تھے، انھوں نے جو انسانیت سوز مظالم کیے وہ اُن کی حالت زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قوم اسرائیل کا گھر اجڑ گیا، اُس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور اُنھیں کہیں دیر تک امان نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی شقاوتِ قلب جس کی مذمت اُن کے انبیاء یکے بعد دیگرے کر چکے تھے، اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں اُنھیں پناہ ملی اُنھوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم امیدوں پر زندہ تھی، لیکن ان اُمیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ آکر جا چکے تھے، لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے۔ حضرت عیسیٰ نے اُن کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اِس معلم کے دل پر، جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا، کتابِ دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا، جو قوم کے سیاہ ترین ایام میں لکھی گئی تھی اور جو اُس کی آرزوؤں کا اظہار اور اُس کے لیے اُمید کا ایک پیغام تھی۔ پہاڑیوں میں پناہ گزین زیلوٹوں کا شدید تعصب، صدوقیوں کی بیجان رسم پرستی، فریسیوں کی ظاہر فرائی آلود منشی، ایسینیوں کا ایک ہاتھ اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلائے اُمیدوں بھرے خواب دیکھنا، اُس درویش پُرخروش کا ملامت آمیز وعظ جس کی زندگی ہیرودیس کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی، ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰؑ کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عقاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا، اور روما کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ترکِ دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ راست خدا کے ہاتھوں قائم کی

جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُرآزاد خواب انھوں نے دیکھا، دونوں اُن کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ کسی سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالمگیر اخوت اور محبت کے پیغامبر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھری قوم میں رہ کر انھوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا شیوہ بنایا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مروت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیروؤں کی بہبودی کا خیال رکھتے تھے چنانچہ انھوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقت ور، دولت مند حکمران طبقوں کے سینوں میں انھوں نے صرف نفرت، خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کیے تھے۔ لیکن غریبوں، جاہلوں، ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انھوں نے شکرگزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ دل میں یہ امید لے کر کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے اس میں انھیں کامیابی حاصل ہونے ہی والی تھی یہودی تعصب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ وہ ہفتہ نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور زندگی پر افسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے اُس کو ہٹایا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اور ان کا پیغام بھی غریبوں ہی کے لیے تھا۔ وہ ربانی علوم میں بڑی دسترس رکھتے تھے، لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں کے لیے وقف رہی۔ ان کے حواری بھی غریب اور ان پڑھ لوگ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ زود اعتقاد تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰ کے پُراسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انھیں حیرت میں ڈال دیا، پھر بھی ان لوگوں نے انھیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ اُن کے مجسم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصور تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مورخ موشیم کہتا ہے کہ "اگرچہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا، تاہم یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علما۔ اور غیر اہلِ کتاب فلاسفر کا مقابلہ خود ان کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے خود ایک آوازِ غیبی کی ہدایت پر ایک تیرھواں شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا، جس کا نام سال تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی۔"[1]

---

[1] MOSHEIM, ECCLESIASTICAL HISTORY, VOL. II, .53.

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بدھ مت کے پیرو ایک مجسّم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے۔ جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا۔ اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک "نیم خدا" کا نظریہ ایجاد کیا۔ اوساٹرس کی پیدائش، موت اور دوسری زندگی کے مصری تصورات، آئی سس سریز کا تصور، یعنی اُس کنواری ماں کا تصور جو نوزائیدہ سورج دیوتا ہورس[۱] کو گود میں لیے ہوئے ہے۔ یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں بھی عام تھے۔ پال، جو ایک صاحبِ علم فریسی تھا، ان نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹراس کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں بھی مبتلا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُسے حضرت عیسیٰ سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسیٰ کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دے یا انھیں ایک مجسّم فرشتہ کہے۔ اُس نے حضرت عیسیٰ کی سیدھی سادی تعلیمات میں فیثا غورثیتِ جدیدہ کے پراسرار نظریے داخل کر دیے، جن میں مشرقِ بعید سے مستعار لیے ہوئے عقولِ سماویہ اور تین واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے۔

ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی اُس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسیٰ کے دو شاگردوں، پطرس اور پال، کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا۔[۲] ایبونی غالباً نبی ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے نمایندے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انھوں نے حضرت عیسیٰ کو "عقلی اور حیوانی زندگی" کے تمام اعمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ کو بچپن، نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ اُن لوگوں کا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو عقیدہ تھا وہ اُن کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا، جس کی قابلِ ذکر کڑیاں ویسینی، مارشونی، پیٹری پاسی اور ان سب سے آخر میں نیس کی کونسل ہے جو ۳۲۸ء میں

---

۱ ملاحظہ کیجیے مسٹر ارنسٹ ڈی بنسن (MR. ERNEST DE BUNSON) کا مضمون بعنوان "محمد کا مقام کلیسا میں" ASIATIC QURTERLY REVIEW, APRIL, 1889

۲ MILNER, HISTORY OF THE CHURCH OF CHRIST, VOL I-H. 26-27.

منعقد ہوئی اُس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذات باری کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے اس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے، بالخصوص انھوں نے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کو دیکھا نہ تھا، ان کی انسانی شخصیت سے آشنا نہ ہوئے تھے اور اُن کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ نہ کی تھی، اُن کی الوہیت کا نظریہ قیل و قال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسیٰؑ نے تبلیغ شروع کی اُس وقت روم کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اُس کے زیر نگیں تھا تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پود کیاری اور مخالف فرقوں کا میدان کارزار بن گئی۔ فریزیوں کی دیوی سبلی[۲] کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیشتر بطلیموس سوتر، جو اسکندر کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دور اندیش جرنیلوں میں تھا، مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریق عبادت ایجاد کرے جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں۔ یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبرِ اعظم کو سوجھا تھا، لیکن جہاں اکبر ناکام رہا وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی، کیونکہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی، زیوس، دیمتر اور اپالو یا ڈائیونیشیس کی پوجا کرتے تھے، مصری، اوسائرس، آئی سس اور ہورس کی: عقیدۂ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اوسائرس اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور رستخیز تھی، یونانی مذہب کا مدار ڈائیونیشیس کی اذیت کشی اور رستخیز۔ یونان کے شہر ایلیوس میں بھی پرستش کے پُراسرار طریقے رائج تھے، جن میں نوواردوں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مصری سرشیش بھی آئی سس کی پُراسرار پرستش کی پیشوائی بھی اُسی قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ کوئی مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی

---

۱ دوسیتی حضرت عیسیٰ کو خالص خدا سمجھتے تھے۔ مارسیونیوں کا عقیدہ تھا کہ "وہ سب سے زیادہ خدا کے مشابہ ہے اُس کا بیٹا یسوع مسیح ہے، اور جسم کی ایک سایہ نما سی شباہت کا جامہ پہنے ہوئے ہے تاکہ انسانی آنکھیں اُسے دیکھ سکیں"۔ پیٹری پاسی اس کے قائل ہیں کہ آسمانی باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ صلیب پر اذیت سہی۔ (موشیم اور گبن مزید ملاحظہ کیجیے نسبینڈر)۔

۲ سبلی کی پوجا ہندوؤں کی مشہور دیوی درگا یا کالی کی پوجا سے قریب کی مشابہت رکھتی تھی۔

کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں ان کے نام کیا تھے۔ انھیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا، ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس نے یونانیوں کے یہاں زیوس کی اور مصریوں کے یہاں اوساٹی رس کی جگہ لے لی۔ آئی سس نے اسکندریہ کے مسلک کی "مادرِ غمخوار" بن کر دیمیتر کو برطرف کر دیا، اور ڈائونیشیس کو اب تک جو خراجِ عبودیت پیش کیا جاتا تھا وہ اب ہورس ہیپوکریٹس کو پیش کیا جانے لگا۔ بہرحال ڈائونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا۔ چنانچہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس جس کی شان و شوکت کے سامنے اُس کے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے اسّی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی۔ اُس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات، اس کے سر منڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پروہت، اس کے سفید پوش نوعمر ادنیٰ پروہت جو مشعلیں اٹھائے چلتے تھے، اُس کے باوقار جلوس، جن میں اوساٹی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم و اندوہ کے پُرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اُکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے صوفیانہ معانی سے مملو پُراسرار عبادات، اور ان سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارتیں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا۔[1]

اگرچہ "دُکھیاروں پر ایک ماں کی مامتا نچھاور کرنے والی" آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلّط رہی، لیکن سورج دیوتا متھرا کے نسبتۀً زیادہ مردانہ وار مسلک نے، جس میں پُراسرار رسومات

---

[1] Dill's Roman Society from New to Marcus Aurelius, Chop. V.; Legge's Forcramer and Rivals of Chrisfianits Vol, ii. P. 87.

کے ساتھ ساتھ کفارۂ گناہ کا نظریہ اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہِ راست تعلق پر اصرار بھی تھا۔ رُومی لشکریوں میں خاص ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ متھرا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آتے۔

عیسائیت کا جو دعویٰ ہے کہ اُسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوعِ انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرماں روائی کرے۔ اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ اُن اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں ممد و معاون ثابت ہوتے۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دُنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوش خبری نے کہ اُن کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی۔ جس میں غریبوں کو سرفرازی حاصل ہو گی اور دولت مند طبقہ کی جگہ غریب جنت کی نعمتوں کا لطف اٹھائے گا، ادنےٰ طبقوں کے دلوں میں امیدوں کی ایک ہل چل برپا کر دی۔ حضرت عیسےٰ کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کے ولولوں سے بھری ہوئی اُمیدوں نے آس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پُر جوش عقیدہ دُور دراز علاقوں میں پھیلتا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدمِ مساوات زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا عوام میں فوراً ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آتے ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی۔ لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس عہد کا ایفا، جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جائے گا، مستقبل کی دھندلی دُوریوں میں آنکھوں سے ہٹتا چلا گیا، تاہم جن توقعات اور اُمیدوں کو اس نے جنم دیا تھا اُن کا زور اس وقت تک کم نہ ہوا جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد، جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دَور تھی، دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے۔ جو عیسائیت کے اُس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے جو اس نے حضرت عیسیٰ کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدہ کے مطابق اُن کے پردۂ غیب میں چھپ

جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک، شام اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکز بنائے ہوئے خدا اور ایک تثلیثِ قدسیہ کا تصور عام تھا۔ مصریوں کے سراپیسی مذہب کا یہ ایک لازمی رکن تھا، لیکن آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقائد کی صورت اختیار کر لی ان کے مانے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رکاوٹ تھی۔ ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی، اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقائد سے واقف ہوئے بغیر انھوں نے فطرتِ الٰہی اور حیات بعد الموت کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں اُن کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے اسرار اور پرانے مسلکوں کی رسومات و عبادات پر بہت سے صاحبِ فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا۔ لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے، اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے اُن کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت اَن پڑھ اور غیر متمدن طبقوں تک محدود رہی۔ جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے ایمانیاتی مسائل اور ان کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ادارے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عبادتی نظام میں داخل نہ کیے اس وقت تک اُسے اصحابِ فرہنگ و ثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے کر آئے جنھوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی ہے۔[1] بہرحال دینِ عیسوی کی نشوونما کے ابتدائی دور میں اس بے پناہ جبر و تشدد نے جو صدیوں تک جاری رہا، عقائد و نظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم مصری دیوی کی جگہ "امن کا ملجا" اور "رحم کا ماویٰ" بن گئیں۔ اب اُن کی پرستش "خدا کی ماں" کے طور پر

---

[1] DILLS ROMAN SOCIETY FROM NERO TO MARCUS AURELIUS, CHAPTER V.

ہونے لگی، جیسی کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترک دنیا خدایانِ اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثاغورس اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے۔ اور انھوں نے اسے گنگا کے ڈیلٹے کے پروہتوں سے، جن کے یہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنا کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی، آئی سس پوجا کے زیر اثر وہ ایک پر تکلف اور پر اسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکتِ عشائے ربانی کا قاعدہ رائج ہوگیا۔ اور تو اور، آئی سس کی سری عبادات سے جو یہ عقیدہ متعلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سر منڈے صفاچٹ داڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش خادموں کو رسومات کی شان و شوکت کو، عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں اور ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ بین عینک لگا کر دیکھیے تو وہ قدیم تر مذہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی اپنے سارے طمطراق اور مسوم دھڑ کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی غیر اہلِ کتاب دنیا کی "مادرِ غمخوار") کے حضور گایا کرتے تھے، اور سینٹ پیٹر یا سینٹ پال کے گرجا سے سراپیوم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

سرسیّد اور اصلاحِ معاشرہ

از شاہد حسین رزاقی

اسلامی ہند کے عظیم مصلح سید احمد خاں کی اصلاحی کوششوں نے مسلم معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کتاب میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ سرسید کے زمانے میں معاشرہ کی حالت کیا تھی انھوں نے اپنی زوال پذیر قوم کی ہر جہتی اصلاح و ترقی کے لیے کیا کوششیں کیں۔ یہ کوششیں کس طرح ایک ملک گیر اصلاحی تحریک بن گئیں، مستقبل پر ان کا کیا اثر پڑا اور معاشرتی اصلاح کے لیے سرسید کا منصوبہ کہاں تک کامیاب ہوا۔ قیمت ۲۵/۴

ملنے کا پتہ :- ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ لاہور